نبی کریمؐ بحیثیتِ معلّمِ اخلاق

محمّد کرم شاہ

یہ جہان رنگ و بو جلوہ گاہ حیات ہے۔ زندگی کی بوقلموں رنگینیوں کے باعث یہ جہاں آباد ہے۔ گو نباتاتی اور حیوانی زندگی میں بھی رنگینیوں کے بڑے دلکش اور دلربا مینا بازار سجے ہوئے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی میں جو رعنائیاں اور ندرت آفرینیاں ہیں، یہاں تخلیقی قوتوں کے جو سمندر موجزن ہیں وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتے۔ یہ انسان ہی ہے جس کو خلعتِ وجود بخشنے کے بعد اس کے خالق نے فرمایا لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ اس قدرت و طاقت والے نے عرش و فرش، کائنات کی لامتناہی پنہائیوں کو لفظ کُن سے پیدا کیا۔ لیکن آدم خاکی کی آفرینش کا ذکر کیا تو فرمایا خلقتہ بیدی۔ میں نے اسے اپنی قدرت کے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔ علم اور عمل، فکر اور تخلیق، تدبیر اور تعمیر کی جو بے پناہ صلاحیتیں اس پیکر خاکی میں ودیعت فرمائیں۔ ان کا تذکرہ "نفخت فیہ من روحی" کے معنی خیز الفاظ سے کیا۔ اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت، علم اور قدرت کا یہ شاہکار سب سے الگ تھلگ انفرادی زندگی بسر کرے، خلاق عالم کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اگر وہ عزلت اختیار کرتا تو وہ بے پایاں صلاحیتیں بے مصرف ہو جاتیں۔ اس چشمہ حیواں سے کوئی تشنہ لب اگر سیراب نہ ہوتا تو اس کی حیات بخش تاثیر کا کسے علم ہوتا، ان صفات کے ودیعت فرمانے والے کے حضور فرطِ عقیدت سے جبین نیاز کون جھکاتا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان، اجتماعی اور معاشرتی زندگی بسر کرے، اپنے بنی نوع انسان سے استفادہ بھی

کرے اور انہیں فائدہ بھی پہنچائے۔ دوسروں کے علوم و فنون سے رہنمائی بھی حاصل کرے اور اپنے فکر و نظر کے چراغ روشن کر کے شبستان وجود کو منور بھی کرے۔ وہ ماں باپ کا بیٹا بھی ہو اور اپنے بیٹے بیٹیوں کا باپ بھی۔ اس کے خاندان کے افراد اس کے لئے تقویت کا باعث ہوں ضرورت کے وقت وہ ان کا سہارا بنے حتیٰ کہ اس کے تعلقات کا حلقہ سارے ملک اور ساری قوم کو اپنے احاطہ میں لے لے۔

ان معاشرتی تعلقات کے باعث حقوق و فرائض کا معرضِ وجود میں آنا ناگزیر ہے۔ معاشرے کا ہر فرد جب تک اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا نہیں کرے گا نیز جب تک اسے اپنے حقوق کی بازیابی کا یقین نہ ہوگا اس وقت تک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ اس لئے حقوق و فرائض میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو قانون کی طاقت سے اس توازن کو برقرار رکھا جائے اور جو شخص بھی اس توازن کو بگاڑنے کا مرتکب ہو اس کی سرکوبی کر دی جائے اور یا اس کی اخلاقی قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ایسے خطوط پر ان کی نشو و نما کر دی جائے کہ پھر ہر قسم کے حالات میں وہ راہِ اعتدال پر ثابت قدمی سے چلتا رہے۔ قانون کی عملداری انسانی زندگی کے صرف چند گوشوں تک ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے ہیں جہاں قانون کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ نیز ہر کام اگر قانون کے زور سے کرایا جائے تو خلوص و ایثار اور محبت و پیار کے غنچے کھِل کر پھول نہیں بن سکیں گے۔ اسلام نے حقوق و فرائض میں توازن پیدا کرنے، پھر اسے برقرار رکھنے کے لئے اور معاشرہ کو ہر قسم کی بے راہروی سے بچانے کے لئے اخلاقی تربیت پر اسی لئے بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

اس سے قبل کہ میں "حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بحیثیت معلم" کے عنوان پر اظہارِ خیال کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ خلق کی تشریح کر دوں تاکہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔

علامہ ابن منظور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں لکھتے ہیں:

الخُلُقُ والخُلْقُ: السجیّتہ وھو الدین والطبع والسجیّتہ وحقیقتہ انہ لصورۃ الانسان الباطنۃ وھی نفسہ واوصافہا ومعانیہا المختصّۃ بمنزلۃ الخَلق لصورتہ الظاہرۃ واوصافہا ومعانیہا۔

ترجمہ: یعنی خُلق اور خُلُق کا معنی فطرت اور طبعیت ہے۔ انسان کی باطنی صورت کو مع اس کے اوصاف اور مخصوص معانی کے خُلق کہتے ہیں۔ جس طرح اس کی ظاہری شکل وصورت کو خلق کہا جاتا ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ جو دانش ایمانی اور دانش برہانی دونوں سے مالا مال ہیں، جو حکمت وفلسفہ کے علاوہ نفسیاتِ انسانی کے بھی ماہر ہیں خلق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالخلق عبارۃ عن ھیئۃ فی النفس راسخۃ عنھا تصدر الافعال بسھولۃ ویسر من غیر حاجۃ الی فکر و رویۃ (احیاء العلوم)

ترجمہ: یعنی خلق، نفس کی اسی راسخ کیفیت کا نام ہے جس کے باعث اعمال بڑی سہولت اور آسانی سے صادر ہوتے ہیں ان کے کرنے کے لئے سوچ بچار کے تکلّف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جو کسی سے اتفاقاً صادر ہوتے ہیں یا کسی وقتی جذبہ اور عارضی جوش سے ان کا ظہور ہوتا ہے وہ خواہ کتنے اعلیٰ اور عمدہ ہوں انہیں خلق نہیں کہا جائے گا۔

خلق کا اطلاق انہی خصائل وعادات پر ہوگا جو پختہ ہوں، جن کی جڑیں قلب و روح میں بہت گہری ہوں۔ انہی غیر متزلزل اور پختہ صفات پر کامیاب زندگی کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے انہی پر اعتماد کرتے ہوئے قومی ترقی اور اصلاح کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ کسی ترنگ میں آ کر اگر کوئی شخص غریبوں اور محتاجوں کی امداد کے لئے اپنے خزانوں

کے منہ کھول دے تو ہم اسے سخی نہیں کہیں گے۔ جو شخص کسی وقتی جوش کے ماتحت اپنے دشمن پر حملہ کر کے اسے مار گرائے اسے ہم شجاع نہیں کہیں گے۔ اس سے یہ توقع عبث ہے کہ جب بھی اسے میدانِ جہاد میں شرکت آنے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کرے گا۔

اس لئے نیک اور عمدہ خصال کو پیدا کرنا پھر ان کو اس طرح پختہ اور استوار کرنا کہ وہ ان سے مطلوبہ اعمال کا ظہور اس طرح بے تکلفی سے ہو جس طرح چشمہ سے پانی ابلتا ہے، یا آنکھ اپنے گرد و پیش کو دیکھتی ہے، یا کان آواز سنتے ہیں۔ یہ کیفیت افراد و اقوام کی صحت مند ترقی کے لئے جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر مشکل اور کٹھن بھی ہے۔ اسی کٹھن اور خطرناک مہم کو سر کرنے کے لئے حکماء و فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں لیکن ان کے باہمی اختلافات اور ان کی نظریاتی کشمکش نے ان کی محنت کو بے ثمر کر دیا۔ وہ یہ طے نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ ایپی قورس اور اس کے ساتھی لذت و الم کو خیر و شر کا معیار ثابت کرنے میں اپنی ذہنی قابلیتیں کھپاتے رہے۔ ان کے معتقدات کے معبد میں مدتوں لذت کے صنم کی پرستش بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ زینو، جو ایک مستقل مکتبہ فکر (مدرسہ رواقیہ) کا موسس تھا، اس نے اس کے برعکس نفس کشی، اور لذات سے کلی اجتناب کو خیر کا سرچشمہ قرار دیا۔ افلاطون استاد ہے اور ارسطو شاگرد، اقلیم دانش و حکمت کے دونوں تاجور ہیں، دونوں کی عبقریت شک و شبہ سے بالاتر ہے، دونوں کا زمانہ بھی ایک ہے، لیکن یہ دو بھی متفقہ طور پر فیصلہ نہ کر سکے کہ خیر و شر کا معیار کیا ہے؟ استاد مثل علیا اور غیر محسوس جہاں کے طواف میں سرگرداں ہے اور اس کا شاگرد ارسطو، عالم محسوسات سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا۔

یہ ذہنی خلفشار صرف اسی زمانہ کی خصوصیت نہیں جبکہ حکمت و فلسفہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھے بلکہ آج بھی جبکہ فکر انسانی کی یلغار سے خلاء میں کہرام برپا ہے بے یقینی کی وہی کیفیت ہے۔ ہربرٹ سپنسر، جان لوک اور ہیگل وغیرہ جن فلسفیوں نے علم اخلاق کے موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، ان کی گنجلک تحریریں پڑھ کر آپ کا سر چکرانے لگے گا۔ انہوں نے

روحوں کو اضطراب، دلوں کو بے چینی اور عقلوں کو بے یقینی کے سوا کچھ نہیں دیا۔ انھوں نے کسی ایسی راہ کی نشاندہی نہیں کی جو مسافر کو منزل تک پہنچادے۔ البتہ انہوں نے آبلہ پا راہرؤں کے راستہ میں تشکیک کے کانٹے بڑی کثرت سے بکھیرے ہیں۔ یقین کی ٹمٹماتی ہوئی شمع جس کی مدھم لو میں افتاں وخیزاں وہ سوئے منزل رواں تھے وہ بھی بجھ گئی۔ ترجمانِ حقیقت حضرت اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:

ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجام خود ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

ان کو اپنا راہبر بنانے والوں پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے اور وہ اپنے ممدوح کو اس کے صحیح روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ فضائل، وہ خصائل حمیدہ، وہ اخلاق عالیہ جن کی تعریف میں اس نے صدہا ورق سیاہ کئے تھے اس کی عملی زندگی میں تو ان کا نام ونشان تک نہیں، بلکہ وہ تو رذائل کی دلدل میں کمر کمر تک دھنسا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اپنی قوم کے اخلاق کو درست کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں وہ انبیاء کرام کا گروہ تھا۔ ان کی باتیں سادہ اور واضح تھیں۔ ان کی تعلیمات میں الجھاؤ اور التباس نہیں تھا۔ ان کے ہاں پیچیدہ علمی اصطلاحات کی بھرمار نہیں تھی۔ بلکہ ان کے ارشادات عام فہم اور دلوں میں گھر کرجانے والے تھے۔ انھوں نے خیر وشر کا معیار لذت والم، نفس پرستی یا نفس کشی کو قرار نہیں دیا۔ انھوں نے اخلاقِ حسنہ کی غرض وغایت بیان کرنے کے لئے سعادت، مسرت، قوت، غلبہ کے مبہم الفاظ استعمال نہیں کئے تاکہ ان کا شارح حسب منشاء ان کو معانی کا لباس پہناتا رہے بلکہ اس کدوکاوش اور جدوجہد کی غرض وغایت رضائے الٰہی کو قرار دے کر ان تمام فکری الجھنوں کو ختم کردیا۔

اس سے بھی زیادہ جس چیز نے گروہ انبیاء کی تعلیمات کو قبول عام بخشا اور ان کے

لئے دلوں کے دریچے کھول دیئے، وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قول وعمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت تھی۔ وہ دوسروں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتے پہلے خود اس پر کاربند ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کے یہ اعمال کسی ذاتی غرض اور منفعت سے وابستہ نہ تھے۔ ان کے اقوال کی دل نشینی، ان کے اعمال کا بانکپن اور ان کے خلوص کی مہک نے ان لوگوں کی کایا پلٹ دی جن کو ان کی صحبت کا فیضان نصیب ہوا۔

لیکن انبیاء سابقین کا دائرۂ کار محدود تھا۔ ان کی نصیحت کا مقصد کسی ایک قوم کی یا کسی ایک ملک کے باشندوں کی اصلاح تھا اور وہ بھی محدود وقت تک کے لئے۔ بارگاہِ الٰہی سے یہ شرف اور یہ اعزاز فقط عبد مکرم، رسول معظم محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ارزانی ہوا کہ آپؐ کی رسالت ہر اسود و احمر، عربی و عجمی، شرقی و غربی کے لئے تھی۔ ارشاد الٰہی ہے وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔ ہم نے آپ کو تمام اولادِ آدم کی طرف بشیر و نذیر بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ کا آفتابِ نبوّت تا قیامت نورافشانی کے لئے طلوع ہوا ہے۔

اصلاحِ اخلاق کا فریضہ جو ہر نبی نے اپنے مقام اور حیثیت کے مطابق انجام دیا اس مقصد کی تکمیل کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے آپ کو وقف فرمایا۔ ارشاد ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

مجھے اس لئے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں مکارم اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔ تکمیل اخلاق کا یہ فریضہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس حسن و خوبی سے انجام دیا اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ اخلاقی تعلیم کی جامعیت
۲۔ اندازِ تعلیم
۳۔ معلّم کی شخصیت

سابق انبیاء کرام کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے صرف زندگی کے چند گوشوں میں راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ایوبؑ ہمیں مصائب و امراض میں صبر و استقامت کی ایک چٹان نظر آتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کے فراق میں آنسوؤں کی لڑیاں پروتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں شدت اور سختی کا عنصر غالب ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کوہِ زیتون پر کھڑے اپنے سامعین کو عفو و درگزر، رحمت و شفقت کی تلقین کرتے سنائی دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے گوشے بھی ہیں جہاں ان نفوسِ قدسیہ نے قدم نہیں رکھا۔ اور ایسے نقوش نہیں چھوڑے جن سے آنے والی نسلیں اپنی منزل کا سراغ لگا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے تمام مہجور و متروک گوشوں کو نورِ ہدایت سے منور کرنے کے لئے اپنے حبیب مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کی خلعتِ زیبا عطا فرما کر اپنی مخلوق کی چارہ گری کے لئے مبعوث فرمایا۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے، ہمیں وہاں زندگی کی بوقلمونیوں کا ایک حسین و جمیل مرقع نظر آتا ہے۔ وہاں جنگ کی شعلہ سامانیاں بھی ہیں اور صلح کی رأفت و رحمت بھی، دشمن نفرت کے انگارے بھی برساتے ہیں اور عقیدت مند اپنی محبت و مودت کے رنگین پھول بھی نچھاور کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے محبوبِ خدا کو حلقہ یاراں میں بھی دیکھا ہے اور حملہ آوروں کے نرغہ میں بھی۔ ہم نے ان کی کاروباری مصروفیتوں کا بھی مطالعہ کیا ہے اور غارِ حرا کی خلوتوں میں ان کے سوز و گداز کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ہم نے انہیں اپنے وطن سے بظاہر انتہائی بے بسی اور بیکسی میں ہجرت کرتے بھی دیکھا ہے اور پھر چند سال بعد اسی شہر میں فاتحانہ انداز میں داخل ہونے کا منظر بھی ملاحظہ کیا ہے۔ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ان کے برتاؤ کا ریکارڈ بھی ہمارے سامنے ہے اور اپنے جاں نثار اور وفا شعار ساتھیوں سے حسنِ سلوک کی تفصیلات بھی ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ الغرض زندگی کے وسیع و عریض میدان کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں حبیب کبریاؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ کے حسین و جمیل نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ یہ جامعیت، یہ ہمہ گیری اسوۂ محمدی کے علاوہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا ہر آدمی اسی آب زلال سے اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اس دار شفا میں انسانیت کے ظاہری و باطنی، سیاسی و معاشی، سماجی اور اخلاقی ہر قسم کے ناقابل علاج روگوں کے لئے اکسیر موجود ہے۔ خاتم الانبیاء کو بارگاہِ الٰہی سے جو کتابِ منیر مرحمت ہوئی اس کے مندرجہ ذیل مقامات کا ہی اگر آپ مطالعہ کریں تو آپ کو حضورؐ کا لایا ہوا نظام اخلاق اپنی تمامتر رعنائیوں اور جملہ زیبائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ملے گا۔ سورہ بقرہ کی آیات ۱۷۶ اور ۱۷۷، سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات، سورۃ الفرقان کی آیات ۶۳ تا ۷۴۔

اندازِ تعلیم : مذکورہ بالا آیات میں اخلاق حسنہ کی اہمیت اور افادیت کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے کوئی سلیم الطبع متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جن میں اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہ بھی بڑے دلنشین اور روح پرور ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ سرور کائنات علیہ التحیات والتسلیمات نماز میں اکثر یہ دعا مانگا کرتے:

اللھم اھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت واصرف عنی سیئاتھا لا یصرف عنی سیئاتھا الا انت (مسلم شریف)

ترجمہ: اے اللہ بہترین اخلاق کی طرف میری راہنمائی فرما تیرے سوا بہترین اخلاق کی طرف کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا۔ اور برے اخلاق کو مجھ سے دور کر دے کیونکہ تو ہی برے اخلاق کو مجھ سے دور کر سکتا ہے۔

یہ اس پاک ہستی کی دعا ہے جس کے اخلاقِ حسنہ کی گواہی عالم الغیب والشہادہ نے یوں دی ہے۔ وانک لعلی خلق عظیم۔ یہ اس پیکر خصائل حمیدہ کی دعا ہے جس کا دامن ہر قسم کی نازیبا حرکات کے داغ سے پاک ہے۔ ایسی ہستی جب عجز و نیاز سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کرتی ہو گی تو خود سوچیئے صحابہ کرامؓ کے دلوں پر اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کے

نقوش کس طرح ثبت ہوتے ہوں گے۔

اہل ایمان کے نزدیک ایمان سے بڑھ کر کوئی قیمتی دولت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو جب یہ ارشاد فرمایا ہوگا تو اخلاق کریمہ کی اہمیت ان کی نگاہوں میں کتنی بڑھ گئی ہوگی۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقاً۔

ترجمہ:۔ جس شخص کا خُلق بہترین ہوگا تمام مؤمنین میں سے اس کا ایمان اعلیٰ اور اکمل ہوگا۔

ہر نیک دل انسان عبادتِ الٰہی میں لذت و سرور محسوس کرتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ یادِ الٰہی کی شمع فروزاں رہے اور وہ بصد جان اس پر قربان ہوتا رہے۔ ہوسکتا تھا کہ کوئی شخص کثرت عبادت پر ناز کرنے لگے اور اخلاق حسنہ کی اہمیت اس کی نگاہوں میں کم ہوجائے۔ اس افتاد سے بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے محبوب نے تنبیہہ فرمادی:

ان الرجل لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم الیل و صائم النھار (ابوداؤد)

انسان اپنے اخلاق کے باعث اس درجہ پر فائز ہوجاتا ہے جو رات بھر ذکرِ الٰہی میں کھڑے رہنے والے اور عمر بھر روزہ رکھنے والے کو نصیب ہوتا ہے۔ کون بندہ ہے جس کے دل میں اپنے پروردگار کی رضا اور محبت کی تمنا چٹکیاں نہ لے رہی ہو۔ اس کا طریقہ بتادیا۔ احب عباد اللہ الی اللہ احسنھم اخلاقاً۔ (طبرانی)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ وہ محبوب ہوتا ہے جس کے اخلاق پسندیدہ ہوں۔ اس طرح ہر مومن کی یہ خواہش ہوگی کہ اس کے ہادی و مرشد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر نگاہِ لطف و کرم ہو اور قیامت کے روز اسے اپنے آقا کے قرب میں جگہ ملے۔ چنانچہ اپنے مشتاقانِ جمال کو یہ فرماکر بشارت دی۔ ان احبکم الیّ واقربکم منی

فی الآخرۃ محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الی وابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقاً۔

ترجمہ: تم میں سے مجھے سب سے پیارا اور آخرت میں سب زیادہ میرے قریب وہ شخص ہوگا جو خوش خلق ہے اور تم میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور روزِ قیامت مجھ سے دُور وہ شخص ہوگا جو بد خلق ہے۔

بیشمار ارشاداتِ نبویؐ میں سے یہ چند اقوال پیش خدمت ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی تڑپ پیدا کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر اور دلنشین اسلوب کوئی کہاں سے لائے گا۔

جن چیزوں کو اخلاقِ حسنہ کہا گیا ہے وُہ کیا ہیں۔

انسانی معاشرہ کا فرد ہوتے ہوئے معاشرہ کے دوسرے افراد کے جو حقوق انسان پر واجب ہیں ان کو حسن وخوبی سے انجام دینا ہی حسنِ خلق کہلاتا ہے۔ ماں باپ، بیوی بچے، پڑوسی، یتیم بیوہ، سائل، بیمار، مسافر، مجاہد، سب کے ساتھ مروت واحسان کرنے کی تاکید ارشاداتِ نبوت میں موجود ہے۔ یہ تعلیم اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ انسان تو انسان حیوانات ونباتات بھی اس میں داخل ہیں۔ شیر دار جانوروں کو تلف کرنے، پھل دار درختوں کو کاٹنے، لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو ویران کرنے، بستے ہوئے گھروں کو اجاڑنے، ان سب چیزوں سے منع کر دیا گیا ہے۔ اسلوبِ تخاطب اتنا شیریں ہے کہ اس کی مٹھاس اور عذوبت روح کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ بخاری شریف میں ایک فاحشہ عورت کا تذکرہ ہے۔ جس کے عمر بھر گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے معاف فرمایا کہ اس نے پیاس سے تڑپتے ہوئے ایک کتے کو پانی پلا دیا تھا۔ بیوہ عورتوں مسکین لوگوں کی خدمت کو جہاد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ بخاری شریف میں ہے:

الساعی علی الارملۃ والمساکین کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النھار ویقوم الیل

ترجمہ : بیوہ اور غریب کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے اور اس عابد کی مانند ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

یتیم کی حفاظت اور کفالت کے شوق کو یوں مہمیز لگائی ہے :

"انا وکافل الیتیم فی الجنة هکذا!"

"کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں ساتھ ساتھ ہوں گے جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں"

بیشک معلّمِ اخلاق کی تعلیمات ہمہ گیر اور عالمگیر ہیں اور اس کا اسلوب بیان بھی دلنشین اور لذیذ ہے۔ لیکن معلّم کریمؐ کی شخصیت میں جو دلربائیاں اور رعنائیاں ہیں وہ قلب ونظر کو مسحور کر رہی ہیں۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر دل دیوانہ اور روح سرشار ہو جاتی ہے۔ ان کی ذات والاصفات میں جو بانکپن اور نکھار ہے اس نے ان کی دعوت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس پر خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ لوگوں کو سچ بولنے اور امانت میں دیانت کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تو خود راست گفتاری اور امانت داری کا وہ بلند معیار پیش کیا کہ خون کے پیاسے بھی صادق اور امین کہنے پر مجبور ہو گئے۔ لوگوں کو وعدہ پورا کرنے کی تلقین کی تو خود اسیر یوں کاربند ہوئے کہ دشمن بھی عش عش کر اٹھے۔ آپ کو معلوم ہے جب قیصر روم نے ابو سفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ حضورؐ کے اخلاق و کردار کے بارے میں دریافت کرے، ابوسفیان اس وقت اسلام اور رسول اسلام کا بدترین دشمن تھا، لیکن اس کو بھی مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ آپ کے اخلاق بڑے بلند ہیں، وہ قول کے پکّے اور بات کے سچّے ہیں۔ عرب کے بدو اور اجڈ لوگ حضورؐ کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر حضورؐ کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ مسجد نبوی کی تعمیر کا وقت آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ اس کی بنیادیں کھود رہے ہیں۔ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حبیب بھی ان

کے ساتھ کام میں برابر کا شریک ہے۔ غزوہ احزاب کے موقع پر جب عرب کے سارے مشرک قبائل نے مدینہ طیبہ پر دھاوا بول دیا، اسلام کے اس مرکز کے دفاع کے لئے خندق کھودنے کا منصوبہ طے ہوا، صحابہ کرامؓ کی طرح حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہاتھ میں کدال لئے خود بھی خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ گیسوئے عنبریں پر مٹی گر رہی ہے، روئے زیبا پر گرد پڑ رہی ہے، اس روح پرور منظر کو دیکھ کر مجاہدینِ اسلام پر کیف و مستی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ بے خودی کی حالت میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجہاد ما بقینا ابدا

ترجمہ:۔ ہم وہ جاں فروش ہیں جنہوں نے محمد مصطفیٰؐ کے دستِ مبارک پر تادمِ واپسیں جہاد کرنے کی بیعت کی ہے۔

سرورِ عالم ہادیٔ برحقؐ ان کے جوشِ ایمانی کو دیکھ کر جواباً فرماتے ہیں:

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرۃ　　فاغفر الانصار والمھاجرہ

اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ الٰہی میرے انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

لشکرِ اسلام میدانِ بدر کی طرف کوچ کر رہا ہے۔ تین تین سپاہیوں کے لئے ایک سواری کا انتظام ہو سکا ہے۔ حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اپنی سواری میں سیدنا علیؓ اور مرثدؓ بن ابی مرثد کو شریک کر لیا ہے۔ مدینہ طیبہ سے جب قدوسیوں کا یہ لشکر نکلتا ہے تو حضورؐ اونٹنی پر سوار ہیں، مقررہ مسافت طے کرنے کے بعد حضورؐ اتر جاتے ہیں۔ اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان میں سے ایک سوار ہو جائے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ ان کی باری میں بھی حضورؐ ہی سوار رہیں اس سے انہیں روحانی مسرت ہو گی۔ حضورؐ جانتے ہیں کہ یہ پیش کش صدقِ دل سے کی جا رہی ہے لیکن حضورؐ کو اچھی طرح علم ہے کہ حضورؐ کا مقام اقدارِ عالیہ کے معلم اور استاد کا ہے، حضورؐ ان کی اس مخلصانہ پیش کش کو قبول نہیں فرماتے بلکہ انہیں یوں جواب دیتے ہیں:

ما انتما باقوی منی ولا انا اغنی عنکما من الاجر۔

کہ نہ تم مجھ سے طاقتور ہو اور نہ یہ بات ہے کہ تمہیں مجھ سے زیادہ اجر و ثواب کی ضرورت ہے۔ چرخِ پیر نے بھی یہ منظر کاہے کو دیکھا ہوگا کہ لشکر کا سپہ سالار، اُمّت کا سردار، اور مجاہدین کا محبوب قائد ناقہ کی نکیل ہاتھ میں لئے پیدل چل رہا ہے اور ایک سپاہی اونٹنی پر سوار ہے۔

یہی وہ اسوۂ حسنہ ہے جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا، یہی وہ اخلاق کریمانہ تھے جنہوں نے سب کو حضورؐ کی محبّت کا اسیر بنا لیا۔ یہی وہ سیرت کا بلند معیار تھا جس نے عرب جیسی وحشی درندہ صفت اور درشت قوم کو کاروانِ انسانیت کا امام بنا دیا۔ اس معلم اخلاق کی تربیت سے وہ اُمت تیار ہوئی جس کے بارے میں خالقِ دوجہاں نے فرمایا:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔